# تاثرات

"طلوعِ اسلام" نے اپنے جولائی کے شمارہ میں اجتہاد سے متعلق ہمارے مضمون پر ایک تنقیدی مقالہ شائع کیا ہے۔ اس میں فکر و استدلال کے کیا کیا عجائب ہیں، اس کا ذکر تو آئندہ سطروں میں آئے گا۔ پہلے ایک چٹکی کا جواب سُن لیجئے۔ پرویز صاحب کا کہنا ہے "جس طرح کسی ملحد و بے دین کا دینداری کے ذوق میں عبدالماجد دریابادی بن جانا خوبی کی بات نہیں، اسی طرح کسی قدامت پرست اہلِ حدیث کا تجدد پسندی کے وفورِ شوق میں نیاز فتحپوری بن جانا بھی کوئی قابلِ قدر بات نہیں"۔ ہم ان سے بالکل متفق ہیں۔ مولوی عبدالماجد دریا آبادی کے معنی اگر جمود و تعصب کے ہیں، تقلید اکابر کے ہیں اور استدلال میں گھٹیا پن اور سفلے کے ہیں تو کوئی متوازن شخص ان صفات کا حامل ہونا گوارا نہیں کرے گا۔ اسی طرح نیاز فتحپوری کا مطلب اگر یہ ہے کہ الحاد و زندقہ کی کھلے بندوں تائید کی جائے اور عقل و فکر ہی کو سب کچھ قرار دیا جائے، تو ہر وہ شخص اس طرح کی ذہنیت سے بیزاری کا اظہار کرے گا جو دین پسند ہے۔ ان دو باتوں کو ہم من و عن تسلیم کرتے ہیں۔ مگر خدارا آپ بھی تو اس حقیقت کو تسلیم کر لیجئے کہ علم و ذوق کے اس دَور میں کسی شخص کا چودھری غلام احمد پرویز ہونا بھی سمجھ میں آنے والی چیز نہیں ہے۔

پرویز صاحب نے ہمارے مقالہ پر تنقیدی نظر ہی نہیں ڈالی، بلکہ ازراہِ کرم ہماری نفسیات کا جائزہ بھی لیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ہم میں ایک تنقیدی شعور نے کروٹ لی ہے، اور ہم مسلک اہلِ حدیث کی صحت و استواری کے قائل نہیں رہے، اور اپنے خیال و افکار کے اعتبار سے اُسی دوراہے پر کھڑے ہیں جہاں مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کھڑے تھے۔ ہم حیران ہیں کہ اس کا کیا جواب دیں۔ اگر علم میں ترقی کرنا جرم ہے، اگر فکر و مطالعہ کی روشنی میں آگے بڑھنا اور اپنے عقائد و تصوّرات کا جائزہ لیتے رہنا گناہ ہے، اور اپنے گرد و پیش پر نظر ڈال کر اپنا ٹھیک ٹھیک مقام و موقف تجویز کرنا معصیت ہے تو یہ اقرار کرتے ہیں کہ ہم نے اس معصیت کا ارتکاب کیا ہے اور آئندہ برابر کرتے رہیں گے۔ رہی یہ بات کہ ہم اہلِ حدیث نہیں رہے۔ تو یہ تفصیل طلب ہے۔ اگر اہلحدیث سے مراد ایک فقہی ذہن ہے، ایک مدرسہ فکر ہے اور مسائل میں ایک مخصوص انداز استدلال ہے، جس میں کتاب و سنت کے مطابق اُصول فقہ کی تشکیل کی جاتی ہے، تو ہمیں اس عقیدہ پر ناز ہے۔ اور اس سلسلہ میں ہمارے خیالات میں ذرا بھی تبدیلی نہیں ہوئی۔ کیونکہ ہمارے نزدیک قرآن و سنت ہمیشہ ہمیشہ

کے لئے ایک مسلمان کے لئے مشعل راہ ہیں۔ اور آزادانہ اور صحت مند اجتہاد کے تمام نتائج انہیں دو سرچشموں سے ماخوذ ہیں۔ اور دین کی انہیں دو بنیادوں پر قائم اور مبنی ہیں۔ لیکن اگر اہل حدیث سے آپ کی مراد اس سے زیادہ اور اس سے مختلف کوئی شے ہے تو یقین جانئے کہ اس سے کبھی بھی ہمارا تعلق نہیں رہا۔ اس سے آگے بڑھ کر ہم یہ کہتے ہیں کہ ہمارے نزدیک حکماء اسلام اور فقہاء عظام نے اسلامی تصورات کو متعین کرنے اور اسلام کے گیسوئے تابدار کو اور تابدار بنانے اور چمکانے کی جو کوششیں کی ہیں۔ ہم فکر و استدلال میں ان سے بھی مدد لینا ضروری سمجھتے ہیں اور ان کو محض تاریخی حوادث سمجھ کر چھوڑ دینے کے قائل نہیں۔ بلکہ ان کو اسلام کا نہایت ہی قیمتی ذخیرہ سمجھتے ہیں۔ کہئے کیا نیاز فتحپوری کے یہی عقائد ہیں؟

تفصیلی گذارشات پیش کرنے سے پہلے ہمیں اجازت دیجئے کہ ہم پرویز صاحب سے ایک دوستانہ گلہ اور کر لیں۔ دینی مباحث میں اختلاف رائے کا ابھرنا بالکل قدرتی امر ہے اور کہیں کہیں ناگزیر بھی ہے، لہٰذا ہر شخص کو حق ہے کہ اپنی رائے کو دلائل کی روشنی میں پیش کرے اور بغیر کسی رو رعایت کے خصم کے دلائل کا پورا پورا تجزیہ کرے اور بتائے کہ انہیں کہاں کہاں خطاء و لغزش نے استدلال و استنباط کی استواریوں میں خلل ڈالا ہے۔ لیکن اس کی اجازت تو کسی حال میں نہیں ہونا چاہئے کہ اصل موضوع کی گہرائیوں میں اُترنے اور متنازعہ فیہ امور سے نمٹنے کے بجائے عوام کو بھڑکایا جائے، اور مخالفت و عناد پر اُبھارا جائے۔ ہم مانتے ہیں کہ پرویز صاحب کے معاملہ میں بعض لوگ زیادتی برتتے ہیں، اور ان کو اس انداز خطاب اور اس اسلوب تکلم سے نہیں نوازتے ہیں کہ جس کے وہ بجا طور پر مستحق ہیں۔ مگر اس کے یہ معنی کب ہیں کہ اس کا انتقام ہم سے لیا جائے۔ اور جا بجا مضمون میں مسلمہ عقائد سے انحراف کا الزام عائد کر کے لوگوں کو مخالفت پر اکسایا جائے۔ ہمیں شکایت یہ ہے کہ بحث کو علمی و تنقیدی حدود میں نہیں رکھا گیا بلکہ نہایت سلیقہ اور ہنرمندی سے مذہبی و دینی حلقوں کو ہم سے بھڑانے کی کوشش کی گئی ہے۔

اور ان باتوں کا تصفیہ عوام سے چاہا گیا ہے جو علمی و دینی دائروں میں سنجیدگی سے غور و فکر کی طالب تھیں جن کا تعلق اصول فقہ میں نازک اور دقیق بحثوں سے تھا اور جو اس لائق تھیں کہ ان کو بغیر کسی واویلا مچانے کے خالص علمی و تنقیدی کسوٹیوں پر پرکھا جاتا۔ خیر اس بحث سے اگر ان کی کسی نفسیاتی پیچیدگی کی تسکین ہو جاتی ہے تو ہم اس پر بھی خوش ہیں۔

سر دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

اب نمبروار ان کے اعتراضات اور ہماری گذارشات ملاحظہ ہوں:

(۱) ہم نے عمرانیات اور تاریخ مذاہب کی روشنی میں عرض کیا تھا کہ جس طرح کا حسن و جمال انسانی

ذوق اور انسانی فہم و ادراک کی نادرہ کاریوں کا رہین منت ہے، اسی طرح مذہب بھی انسان کے ذوقِ جمال سے بے نیاز نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی تشریح، اس کی وضاحت اور ترجمانی سے اس کے حسن و جمال میں اور اضافہ ہوتا ہے، اس کا رنگ اور نکھرتا ہے اور اس کے خدوخال زیادہ ممیز اور زیادہ نمایاں ہوتے جاتے ہیں۔ یہی نہیں اس کے اطلاقات، زمانی و مکانی قیود سے نکل کر زیادہ عمومی اور ہمہ گیر سانچوں میں ڈھلتے چلے جاتے ہیں۔ پرویز صاحب اس اصول کو تسلیم کرتے ہیں اور مانتے ہیں کہ انسانی اجتہاد سے جزئیات میں تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔ چنانچہ ان کا کہنا ہے کہ "یہی کیفیت دین کی ہے، اس میں کچھ عناصر غیر متبدل ہیں، اور کچھ ایسے جن میں زمانے کے تقاضوں کے ساتھ ساتھ تبدیلی ہونی چاہیئے۔ اوّل الذکر وہ مصرح احکام یا غیر مصرح اصول ہیں جو قرآن کے اندر محفوظ ہیں، ان میں کوئی تبدیلی نہیں ہوسکتی۔ اور ثانی الذکر وہ جزئیات ہیں، جو قرآنی اصولوں کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے اسلامی نظام متعین کرتے رہتے ہیں ان میں زمانے کے تقاضوں کے مطابق تبدیلی ہوسکتی ہے۔

ہمارا موقف اس سلسلہ میں یہ ہے کہ اصل تقسیم مصرح اور غیر مصرح کی نہیں ہے، بلکہ یہ ہے کہ قرآن و سنت میں بعض اُصول قطعی، غیر متبدل اور غیر زمانی ہیں۔ اور کچھ احکام و مسائل ایسے ہیں کہ جو اگرچہ مصرح ہیں مگر ان کا اطلاق حالات و ظروف اور شرائط و قیود کے تحت بدلتا رہتا ہے۔ جیسے مثلاً غلامی کا مسئلہ ہے کہ قرآن نے بعض جزئیات کی شکل میں ان کو بہرحال تسلیم کیا ہے۔ حدیث و سنت میں اس سے متعلقہ تفصیلات اس کثرت سے ہیں کہ کسی طرح انکار نہیں کیا جاسکتا، اسی طرح فقہ میں اس کے بارہ میں وہ وہ موشگافیاں مذکور ہیں کہ اس دَور کا انسان ان کو آسانی سے سمجھ بھی نہیں سکتا۔ لیکن اس تصریح، ان تفصیلات اور تصریحات و تشریحات کے باوجود غلامی اپنے تمام متعلقات کے ساتھ آج ممنوع ہے، اور کوئی دلیل اس کے جواز میں پیش نہیں کی جاسکتی۔ اس سلسلہ میں یہ عذر نہایت ہی بارد اور مہمل ہے کہ قرآن نے تو شروع ہی سے غلامی کو ناجائز قرار دے دیا تھا؛ سوال یہ ہے کہ کہاں اور کس آیت کی رُو سے؟ کیا یہ حقیقت نہیں کہ قرآن نے ایک تہذیبی مجبوری کی حیثیت سے اس کو تسلیم کیا ہے اور اس سے متعلقہ مسائل کی وضاحت کی ہے، اس سلسلہ میں بھی آیات پیش کرنے کی ضرورت ہے۔ اور یہ بتانے کی حاجت ہے کہ نکاح اور کفارات کی صورت میں غلامی کو ایک حقیقت کے طور پر قرآن نے مانا ہے؟ جب ایسے حقائق سے بھی انکار کیا جائے گا تو تفصیلی بحث ہو چکی اور آپ یا قارئین کسی نتیجہ پر پہنچ چکے یہ درست ہے کہ آپ قرآن کی کسی من مانی تاویل کی بنا پر احادیث کے پورے ذخیرہ کو ناقابلِ اعتماد ٹھہرا سکتے ہیں۔ فقہی تسلسل اور تاریخی تواتر کو جھٹلا سکتے ہیں، اور تہذیب و تمدّن کی مسلمہ روایات کو پسِ پشت ڈال سکتے ہیں۔ لیکن ہماری مجبوری یہ ہے کہ ہم ایسا نہیں کرسکتے، ہمیں قرآن کے ساتھ شارحِ قرآن کے عمل کو بھی دیکھنا ہے، محدثین کے فہم و ذوق کی بھی کوئی نہ کوئی توجیہ بیان کرنا ہے، اور تاریخ اور تہذیب و تمدّن کے مسلمہ حقائق کو بھی نظر و بصر کے سامنے رکھنا ہے،

آخر ہم یہ زبردستی کیسے اختیار کرلیں اور کیونکر پوری علمی دنیا کو یقین دلادیں کہ قرآن تو غلامی کو ناجائز قرار دیتا ہے، مگر یونہی اور بلاسبب یہ مسئلہ پوری اسلامی تہذیب کا مسئلہ بن گیا۔ ظاہر ہے کہ یہ موقف اس دور کے کسی پڑھے لکھے انسان کو مطمئن نہیں کرسکتا۔

پرویز صاحب کے اس اعتراف میں جو تناقض ہے اس پر بھی ایک نگاہ ڈالتے جائیے :

سوال یہ ہے کہ دین کی وہ جزئیات جن کو آپ متبدل سمجھتے ہیں مصرح ہیں یا مصرح نہیں ہیں۔

اگر مصرح ہیں تو ان میں تبدیلی کیونکر ممکن ہے۔ اور اگر مصرح نہیں ہیں تو وہ دین کا جزو کیونکر قرار پائیں، اور دین کس طرح ہوئیں۔ پھر اگر استدلال و استنباط سے ثابت شدہ کوئی حقیقت دین کا جزو بن جاتی ہے تو اس پر دو اعتراض وارد ہوتے ہیں :

۱۔ جب وہ جزء دین ہے تو یہ اسی طرح غیر متبدل ہوگا جس طرح کہ وہ جزئیات جو مصرح ہیں۔ لہذا تقسیم بے معنی ہوئی۔

۲۔ اور اگر شرح و استنباط دریافت شدہ کوئی مسئلہ دین کی حیثیت اختیار کرلیتا ہے تو شارح اوّل اور ان کے بعد تمام آئمہ اجتہاد کے نتائج فکر کو بھی دین کے دائرہ میں داخل کرنا پڑے گا۔ کیا اس کے لئے آپ تیار ہیں۔ (باقی)

محمد حنیف ندوی

---


# مسئلۂ اجتہاد

(مصنفہ محمد حنیف ندوی)

قرآن، سنت، اجماع، تعامل اور قیاس کی فقہی قدر و قیمت اور ان کے حدود پر ایک نظر۔

صفحات ۱۸۴۔ قیمت -/۳ روپے

ملنے کا پتہ

ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ۔ کلب روڈ۔ لاہور